اظہارِ رائے کی آزادی: اُمت، تنظیم، معاشرت

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی ° / ترجمہ: ڈاکٹر محی الدین غازی

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور اسے خلیفہ بنا کر زمین کے تمدن اور اس کی برکتوں کی افزایش کا امین اور اس میں حق و انصاف کے قیام کا ذمہ دار بنایا۔ کائنات کے حیوانات اور نباتات، سمندر اور دریا، غرض ہر چیز کو اس کے لیے مسخر کیا، اس کے ارادے کا پابند بنایا۔

اسے اس کائنات میں چیزوں کی افزایش کرنے، انھیں مسخر کرنے اور ان کے فائدوں کو سمیٹنے کی استعداد بھی عطا کی گئی ہے، جب کہ کائنات کی تخلیق اور اس کو لپیٹ دینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ وہی ہے جس نے ہر چیز کو خلقت دی اور ہدایت بھی کی۔ یہ اللہ کی شانِ تخلیق ہے جس نے ہر چیز کو بہترین ساخت پر بنایا۔ امانت اور خلافت کا منصب اسی کو سونپا جاسکتا ہے جو صلاحیت اور اختیار کا حامل ہو۔ چنانچہ انسان کو مختلف شکلوں اور نوعیتوں کی صلاحیتوں سے نوازا گیا، اسے اختیار بھی دیا گیا، ورنہ جو بے بس، مجبور اور دوسرے کے ارادے کا پابند ہو اسے ایسی ذمہ داری دینا بے معنی ہے۔

آزادیِ اظہارِ اور ایمان

آزادی اسلام کے پیغام کا جوہر (essence) اور اس کے عقیدے اور شریعت کا محور ہے۔ اس دین کی اس خصوصیت کو مجبوروں، کمزوروں، دبے کچلے اور ستم رسیدہ لوگوں نے جان لیا تھا۔ چنانچہ وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور وہی اسلام کے اوّلین علَم بردار تھے۔ دوسری طرف اہلِ جبر و غرور نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اس دعوت کو جھٹلایا،

° ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی (۱۹۳۵ء فلوجہ، عراق-۴مارچ ۲۰۱۶ء، واشنگٹن)، ممتاز عالم، تحریک اسلامی کے مربی اور رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن تھے۔ یونی ورسٹیوں میں فقہ کے استاد، اُمت اسلامیہ کی نشاتِ ثانیہ کے آرزومند اور 'انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف تھاٹ' (IIIT) کے صدر تھے۔

اس کا مقابلہ کیا اور ہر طرح کی رکاوٹیں اس کے سامنے کھڑی کیں، مگر اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کی، اپنے لشکر کو غالب کیا اور تنہا ساری دشمن طاقتوں کو شکست دی۔

'ایمان' اپنے اسلامی دائرے میں عقل، وجدان اور انسانی ضمیر کی آزادی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ایمان کے ذریعے عقل کو تمام تر توہمات، جبر اور گمراہ کن راستوں سے آزادی ملی۔ وہ غور وفکر اور تجزیہ واستدلال کے زیور سے آراستہ ایک آزاد عقل بن گئی، جس کا معلومات کو قبول یا انھیں مسترد کرنے میں بااصول اور فیصلہ کن منہاج تھا۔ یہ معلومات خواہ زبانی روایت ہوں یا تحریری عبارت، سماعی ہوں یا اجتہادی، عالم غیب سے منسوب ہوں یا عالم حضور سے، قابل قبول وہی بات ہوتی تھی جس کے حق میں دلیل وبرہان موجود ہو۔ معرفتوں کی ساری صورتیں بلا استثنا اس اصول کے تابع تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی بہت سارے امور کو جنھیں خود اس نے مقدر کیا اور جن میں سے رسولوں کو بھیجنا بھی شامل ہے، دلیل وبرہان سے جوڑ دیا، تاکہ اللہ کے خلاف لوگوں کے پاس کوئی حجت نہ رہے۔ انبیاؑ کو معجزات دیے تاکہ ان کے پاس لوگوں کو دکھانے کے لیے دلیل رہے، جو ان کی نبوت پر دلالت کرے اور ان کے دعوے کی صداقت کو قوت بخشے۔

اسی طرح ایمان نے مومن کے وجدان اور اس کے ضمیر کو مکمل طور سے جبر کی ان تمام تر شکلوں سے ہمہ گیر آزادی عطا کی، جو انسان کے ضمیر اور بصیرت [intuition] کو مقید یا ان کی فعالیت کو مفلوج کر دیتی ہیں، کہ انسان اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ فکری، تمدنی اور تہذیبی فعالیت کے میدانوں میں قدم رکھے، اجتہاد کرے اور اس عالمِ وجود میں خالق عظیم کی قدرت کے آثار کی نمایش میں تخلیقیت کا مظاہرہ کرے۔ اس لیے بھی کہ انسان کی توانائیاں اور اس کی اجتہادی اور تخلیقی قوتیں اس عالمِ وجود میں 'خلیفہ' [vicegerent] کی حیثیت سے ابھر کر آئیں۔ جس کے لیے اللہ نے فرشتوں پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ باصلاحیت اور زمین کی وراثت وخلافت کا زیادہ حق دار ہے:

اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا)، تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ اُنھوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو آپ

ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں'۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا: ''تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ''۔ جب اس نے اُن کو اِن سب کے نام بتادیے، تو اللہ نے فرمایا: ''میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی میں جانتا ہوں'۔ (البقرہ ۲: ۳۱-۳۳)

اس طرح ایمان نے انسان کے ارادے کو آزادی سے نوازا اور اسلام نے اس آزادی کو تحفظ کی مطلوبہ ضمانتوں کا حصار دے دیا۔ اب کسی کے لیے اس کی گنجایش نہیں تھی کہ اس کو اس کے ارادے کے علی الرغم مجبور کردے۔ تاہم خدا بنے بیٹھے اربابِ غرور، اکثر مذہب کو بھی انسان کا ارادہ تباہ کرنے اور اس کی آزادی سلب کرلینے کا ذریعہ اور ہتھیار بناتے ہیں۔ اس دین وحید نے جو اللہ کے نزدیک ہدایت کا دین اور آخری حق ہے، صاف صاف اعلان کردیا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قف قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ج (البقرہ ۲: ۲۵۶) دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات، غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

انسان پختہ اور بالغ ہوچکا ہے، وہ زندگی کے ابتدائی مرحلے سے آگے بڑھ چکا ہے۔ اب اسے ضرورت نہیں کہ کوئی بھی چیز جبر کی تلوار، دباؤ اور ڈراوے کے طریقوں سے قبول کرے جیسا کہ پہلے تھا۔ ارشادِ ربانی ہے:

وہ وقت بھی کچھ یاد ہے، جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آپڑے گا، اور اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں، اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو۔ (الاعراف ۷: ۱۷۱)

اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ (الاعراف ۷: ۱۵۷)

یہ طریقے رحمت کی شریعت کے ذریعے منسوخ کردیے گئے۔

'رائے اور اس کے اظہار کی آزادی' کو اسلامی ایمان محض ایک حق قرار نہیں دیتا کہ انسان چاہے تو اس کا مطالبہ کرے اور چاہے تو اس سے دست بردار ہوجائے، بلکہ یہ اس کا فرض، ذمہ داری اور امانت ہے۔ یہ اس رکن کا حصہ ہے، جسے بہت سارے علما ارکان اسلام میں چھٹا رکن قرار دیتے ہیں۔ یہ بہت نازک رکن 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا حصہ ہے۔ چنانچہ معاشرے میں کوئی برائی اور کوئی غلطی اگر ابھرتی ہے تو سارے لوگوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ اسی طرح ان پر مشترک اور باہم مل کر ادا کرنے والی یہ ذمہ داری بھی عائد ہوگی کہ اس برائی کو مٹائیں اور انحراف کو درست کریں۔ ہر ایک اپنی طاقت کے حدود اور اپنے کام اور سرگرمی کے دائرے میں اس کا مکلف ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ غلطی یا انحراف دین کے فہم سے متعلق کسی مسئلے میں ہے یا سماج کے کسی مسئلے میں۔ اس میں بھی فرق نہیں ہے کہ انحراف چوٹی پر ظاہر ہوا ہے یا بنیاد میں، بلکہ حکام، اعلیٰ قیادت اور سماج کے فیصلہ ساز لوگوں کے انحراف کے خلاف آواز بلند کرنے کی زیادہ حوصلہ افزائی اور زیادہ ترغیب ملتی ہے۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا: شہیدوں کے سردار (قیامت کے دن) حمزہ بن عبدالمطلب اور وہ آدمی ہوگا جو ظالم سلطان کے سامنے کھڑا ہوا، بھلائی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اس پر اس نے اسے قتل کردیا۔(مسند ابی حنیفہ، ص ۱۳۳)۔ آپؐ نے فرمایا: ''افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا ہے'' (سنن ابی داؤد)۔ اس حدیث میں امت کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ رائے کی آزادی، اس کے اظہار کی آزادی اور منکر کی مخالفت کے سلسلے میں اپنا محض حق نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری کو بھی ادا کرتی رہے۔ چاہے اس راہ پر چلتے ہوئے کچھ قربانیاں دینی پڑیں اور ظالموں اور جابروں کے ہاتھوں کچھ لوگ شہادت کا جام نوش کریں۔ دراصل، ہدایت الٰہی کے یہ باغی اور ظالم عناصر چاہتے ہیں کہ لوگوں کو تہذیب کی تعمیر میں ان کے حقیقی کردار کی ادایگی سے روک دیں، اور انھیں معاشرے کے انحراف [deviation] اور زوال [decadence] کو درست نہ کرنے دیں۔

اسلامی روایت

آزادی کے یہ تصورات اسلام کے دور اوّل میں حکومت اور رعایا سب میں عام اور

معروف تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس ایک قبطی، فاتح مصر اور گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے لڑکے کی شکایت لے کر پہنچا۔ جب خلیفۂ عادل نے دونوں سے بدلہ لے کر اور اسے انصاف دے کر راضی کر دیا تو انھوں نے یہ عظیم اعلان کیا: ''تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، انھیں تو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا''۔ حضرت علیؓ سے بھی یہ قول روایت کیا گیا ہے: ''اے لوگو آدم سے نہ غلام پیدا ہوا تھا نہ لونڈی، بلاشبہہ سب لوگ آزاد ہیں''۔ (نہج السعادۃ، ج ۱، ص ۱۹۸)

اہمیت کے کسی بھی درجے کا کوئی اہم معاملہ ہوتا تھا تو پوری امت کو اپنی راے بیان کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ چرواہوں سے ان کی چراگاہوں میں مشورے لیے جاتے تھے اور پردہ نشینوں سے ان کے پردے میں۔ اور جب ایک مسلمان حضرت عمرؓ کی کسی بات پر اعتراض کرتا ہوا آیا جو اس کے سامنے واضح نہیں ہوسکی تھی، اور اس نے اعتراض میں شدت کا مظاہرہ کیا۔ مجلس کے کچھ لوگوں نے اسے خاموش کر کے وہاں سے ہٹانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے انھیں روک دیا اور فرمایا: اسے کہنے دو، تم اگر ایسی باتیں نہیں کہو گے تو مانو تم میں کوئی خیر نہیں ہے اور ہم انھیں نہیں سنیں گے تو مانو ہم خیر سے خالی ہیں''۔

حضرت ربعی بن عامرؓ سے جب رستم نے جہاد کے لیے نکلنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا تھا: ''ہمیں تو اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم جسے وہ چاہے اس کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں، مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل، اور دنیا کی تنگی سے دنیا و آخرت کی وسعت میں داخل کریں''۔ گویا ضمیر، بصیرت، ارادہ، تعبیر اور تحریک ہر پہلو سے انسان کی آزادی اور ان ساری آزادیوں کی حفاظت اور دفاع، اسلام کے اہداف اور اسلامی جہاد کے مقاصد کا جوہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے اگر خلافت راشدہؓ زیادہ عرصے تک چلتی رہتی اور اسے موقع ملا ہوتا کہ وہ ایسے سلسلے [channels] بنائے، جو ان آزادیوں کو منظم کریں اور ان کی حفاظت کی ضمانت لیں تو ایسی صورت میں امت پر پس ماندگی کے وہ اسباب مسلط نہ ہوتے، جنھوں نے اسے ایسی امت سے جو لوگوں کے سامنے لائی گئی تھی تاکہ نمونہ اور شہادت کے منصب پر رہے، اس اُمت میں تبدیل کر دیا جو اپنے تہذیبی کردار سے بھی پیچھے ہٹتی جارہی ہے۔ وہ امت جو اس کے بعد اللہ کے بندوں کی آزادی غصب کرنے والے ظالموں اور جابروں کی پیدایش کی عادی ہوگئی۔ جب سے

خلافت راشدہ، ملوکیت میں تبدیل ہوئی ہے، اس وقت سے آج تک وہ ایسے لوگوں کے غول درغول پیدا کیے جارہی ہے۔

کوئی شک نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کی کم عمری اور بادشاہت سازی میں کچھ لوگوں کی جلد بازی نے بہت سارے بنیادی اسلامی تصورات کو غیر مؤثر کر دینے میں کردار ادا کیا۔ جن میں آزادی کا اپنی مختلف شکلوں میں محدود ہونا بھی شامل ہے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان بڑے پیمانے پر ایسا فکری اور ثقافتی ورثہ بھی وجود میں آگیا، جو ان انحرافات کو بنیاد فراہم کرتا ہے اور آزادیوں کی مختلف شکلوں کو محدود یا ختم کر دیتا ہے۔ ایسے غیر صحت مند فکری ورثے کو اختیار کرنا بھی جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ کوئی اس پر فخر کرے، اس کا دفاع کرے یا اس کو عام کرے، اور اسے اسلام کی تعلیمات اور اس کی بنیادی 'قدروں' میں شمار کرنے کی جسارت کرے۔ شاید اسی ورثے میں سے وہ کچھ بھی ہے جو سد الذرائع اور الأخذ بالاحتیاط أو الأحوط کے قاعدوں کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔

لوگوں نے بدقسمتی سے ان دونوں قاعدوں یا اصولوں کو سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ خاص طور سے ظالم حکومتوں نے ان کا بہت زیادہ غلط استعمال کیا ہے۔ جب انھوں نے ان دونوں قاعدوں کو ان کے دائرے اور ان کے بہت محدود اور مخصوص فقہی میدان سے اُٹھا کر انھیں دو فکری بنیادیں بنا ڈالا، جو امت کے فکری سفر کو گرفت میں لاتے ہیں، اور اس کی تمام تر تفصیلات پر فیصلہ کن فیصلے صادر کرتے ہیں، اور ان کو امت کے دماغ کی نگرانی کا حق دیتے ہیں کہ اس کی زبان پر تالا لگا دیں، جن میں تنہا ایک ظالم کی ضرورت کا تقاضا ہو تو اس کے حاشیہ برداروں کی بھی تعریف و ستایش لازم کر دی جائے۔

ظالموں اور ان کے حاشیہ برداروں نے ہمیشہ امت کو ایک فاتر العقل یا یتیم بچے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ایسے سفاک حاکم طبقے بزعمِ خود یہ سمجھ بیٹھے اور یہ باور کرانے لگے کہ: ''یہ اُمت چونکہ نہیں جانتی کہ اس کا فائدہ یا نقصان کس میں ہے، اس لیے اس کا ایک 'ولی' ہونا ضروری ہے جو اس کی ضرورتوں اور مسائل کو سمجھے اور ان کا انتظام کرے''۔ اور پھر خود بخود یہی ظالم و جابر ہی اس ذمہ داری کو رضاکارانہ طور پر اٹھانے کے لیے اور ولایت و نگرانی کا کام انجام دیں۔

یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ وحی الٰہی میں اعلان موجود ہے کہ: یہ امت گمراہی پر جمع ہونے

سے محفوظ ہے اور غلطی پر جمع ہوجانے سے بھی بچالی گئی ہے۔ اور اگر وہ غلطی کرے گی بھی تو ان ظالم وجابر آمروں جیسی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔ وحی نے یہ اعلان بھی کیا کہ: امت سے بے نیازی اس کے ارادے اور خواہش سے تجاہل اور اس کی خیرخواہی اور اسے مشورے میں شریک کرنے سے پہلوتہی دراصل استبداد [dictatorship] اور سرکشی کا اہم ترین دروازہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

> ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ (العلق۹۶:۶-۷)

اگر 'رائے اور اس کے اظہار کی آزادی' مسلمانوں کی زندگی میں فکروعمل کا ایک مضبوط ستون بن کر رہتی، جیسا کہ رسولؐ اللہ اور خلفاے راشدین کے زمانے میں تھا، تو اُمت کو پے در پے ہزیمتوں کا منہ نہ دیکھنا پڑتا اور آج اُمت پستی کے اس گہرے کھڈ میں نہ گری ہوتی۔

اس امت میں اصلاح کی بہت ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا گیا۔ ان کوششوں کے اثرات کومقید کرکے امراض کے ایک مجموعے کے ذریعے تباہ کردیا گیا۔ ان امراض میں فکری بحران، ثقافتی پسپائی، سیاسی جبر، خودشناسی کا فقدان بھی ہیں، تاہم ''صحت مند پختہ دماغ کی غیرموجودگی اور اگر وہ موجود بھی ہوتو اسے فعال ہونے سے روکنے کی ہر وسیلے سے کوشش'' کا مسئلہ پسپائی کے اسباب، غلطی کے محرکات اور خلل کی وجوہات میں سرفہرست ہے۔

آزادی سے محرومی کے اثرات

راست فکر، دانش مندی اور یکسوئی سے محرومی کا معاملہ بے حد نازک ہے۔ پختہ فکرودماغ کے حاملین ایسی امت میں کیسے جنم لے سکتے ہیں، جس امت کے سارے امکانات کو عقل وخرد [reasoning] کے محاصرے اور اس کی تحقیر پر، ذہن کا دائرہ تنگ کرنے اور فکر کا مذاق اڑانے پر، اور تقلید اور تابع داری کے اسباب پیدا کرنے اور ان کا کوہ ہمالہ تعمیر کرنے پر مامور کردیا گیا ہو۔

یہ چیز نظام ہاے حکومت تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ یہ ان گروہوں، تنظیموں، اداروں اور جماعتوں تک میں سرایت کرگئی، جنھیں اس امید کے ساتھ قائم کیا گیا تھا کہ وہ امت کو اس حالت زار سے نکالنے اور اس بحران سے گزارنے میں معاون ہوں گی، جو امت کے صالح عناصر کی پرورش کی بہترین آغوش بنیں گی۔ ہوا یہ کہ وہ بھی اسی ڈگر پر چل نکلیں کہ: ''نافذ کرو اور پھر بحث کرو''۔

یہاں تک کہ اسلامی جماعتیں اور تنظیمیں بھی اس سے محفوظ نہ رہیں کہ کسی کی رائے کو روکیں یا رد کر کے اس پر پابندی لگا دیں، یا پھر حسب ضرورت اس رائے رکھنے والے کو تنظیم سے الگ کر دیں، اس کی کتابوں کو برسرِحق گروہ یا مددِ خداوندی کی مستحق جماعت میں گردش کرنے سے روک دیں۔

اس کے لیے مختلف دلیلیں بھی دے دی جاتی ہیں، مثلاً اطاعتِ امر واجب ہے، یا یہ کہ صاحبِ امر پریشانی سے دوچار نہ ہو۔ ان لوگوں نے وہ سب کچھ جو ہمارے فقہی ورثے میں تھا اور بادشاہت اور جبر کے زمانوں کی پیداوار تھا، اسے تحریک یا تنظیم کے اولی الامر کی گود میں لا کر ڈال دیا، تاکہ اس کے پاس شرعی وسائل، ماضی کے ہتھیار اور سرکوبی کرنے کے وہ اختیارات رہیں جو شورائیت کو روک سکیں۔ دوسرے کی رائے اور اس کے اظہار کے سامنے دیوار بن جائیں تاکہ تنظیم کا قائد ظالم حاکموں کی جانشینی کا مستحق ٹھیر سکے، مگر 'اللہ کی حاکمیت' کے نعرے کے ساتھ۔

یہی نہیں، بلکہ یہ وبا ہمارے گھروں اور خاندانوں تک پہنچ گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گھر کا بڑا گھر کا آقا بنا ہوا ہے۔ اس کی بات گھر میں چلتی ہے۔ اس کے سامنے کوئی ہونٹوں کو جنبش دینے کا حق نہیں رکھتا (اس کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہیے کہ آج مسلم خاندان کے ذمہ دار کی حیثیت رہایشی ہوٹل یا ریسٹورنٹ کے منیجر کے رول سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لیے اتنا وقت نہیں ہے، جو انھیں خاندان کے مفہوم سے آشنا کرے)۔ غرض استبدادی یا آمرانہ طرزِ فکروعمل اور دوسرے کی رائے کو ٹھکرانا بلکہ جڑ سے اکھاڑنے اور معاشرے کے وجود اور اس کے خلیوں میں اس کی موجودگی کو ختم کرنے کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ امت میں ''عوامی کج فہمی، حیوانوں جیسا مزاج اور غلاموں کی سی نفسیات'' کی اصطلاحات کا انبار لگ گیا۔

استبداد نے اس امت کو اس حالت تک کیسے پہنچا دیا؟ جب کہ یہ وہ امت ہے جس کے قدیم افراد، یعنی اصول فقہ کے علما نے 'رائے' کو شریعت کی ایک دلیل قرار دیا تھا۔ معتبر شرعی ذریعوں سے رائے، جس نتیجے تک پہنچائے، وہ رائے لوگوں کے یہاں شریعت کی طرح لائق عبادت ہوتی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بعد والوں کے یہاں وہ بدعت، جرم، انحراف، اعتزال، سنت سے بغاوت، اطاعت سے دُوری، غرض وہ کچھ ہوگیا کہ کچھ لوگ امت کی فضا کو اس سے پاک کرنے اور اس سے محفوظ رکھنے کی دہائی دینے لگے۔ اسے ایسی گمراہی قرار دینے لگے جس سے لوگوں کو ہوشیار کرنا فرض

ہو اور ایسا دروازہ جسے بند کرنا واجب ہو، تاکہ امت پر شر کے وہ دروازے نہ کھل جائیں، جو بند ہی نہ ہوسکیں، غرض سوچنے کا عمل رُک گیا۔

یہ سمجھا گیا کہ غور وفکر، نئی سوچ اور نئے راستوں کو تلاش کرنے سے رک جانا ہی بہتر ضمانت ہے، یعنی ٹھیرے ہوئے ساکن افکار کا مجموعہ ہی اُمت پر حکمراں رہے۔ اس کے دماغ پر حاوی رہے اور حسبِ ضرورت اس کو بار بار پیدا کیا جاتا رہے۔ جان لیجیے کہ اس کے بعد امت پر 'شر' کا کون سا دروازہ ہے جو نہیں کھلا؟ ساری برائیاں خدا کی پناہ اس امت کی زندگی میں ہر جانب سے داخل ہورہی ہیں۔ کھلے دروازے تنگ پڑتے ہیں تو کھڑکیوں سے 'شر' یلغار کرتا گھس آتا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس قضیے کو مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے: ''ظالموں کا استبداد، عالموں کی بے بسی اور فرزندانِ اُمت کی جہالت، نہ کہ رائے کا اظہار اور اس کے اظہار کی آزادی''۔

ظالموں کے استبداد کے اثرات اور خطرات جانے پہچانے ہیں۔ قرآن اور احادیث نبوی جو اس سے خبردار کرتے ہیں تو وہ بھی معروف ہیں۔ قرآن مجید کی کسی سورت کی تلاوت کریں وہ پوری شدت سے استبداد اور سرکشی سے اور تہذیبوں کی تباہی، قوموں کی پسپائی اور کائنات کی بربادی میں ان کے اثرات سے متنبہ کرتی ہے۔ رسولؐ اللہ کی سنت بھی ایسی ہدایات سے بھرپور ہے، جو استبداد، طغیان اور سرکشی سے ڈراتی ہیں۔ ان کے مقابلے اور ان کے سدباب کے لیے سارے وسائل اور ساری توانائیاں صرف کردینے کو واجب قرار دیتی ہیں۔

اظہارِ رائے اور اسوۂ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کو پختہ رائے سازی اور اظہار رائے کے تمام تر وسائل کی تعلیم دینے میں ایک شان دار نمونہ عطا کرتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ کے ساتھ مشاورت، مراجعت اور گفتگو، نیز اپنی غیر موجودگی میں اجتہاد کی ترغیب دی، جو زیربحث مسئلے پر مضبوط دلیل ہے۔ اس کے باوجود کہ آپؐ اس روے زمین پر سب سے مضبوط دماغ، پاکیزہ ترین عقل اور روشن ترین فکر کے حامل اور اکمل انسان تھے، مگر شوریٰ کو نظرانداز نہ کرتے تھے اور نہ اس سے تجاوز کرتے تھے۔ نہ بڑے معاملات میں اور نہ معمولی چیزوں ہی میں۔ آپؐ معصوم تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو درست رائے اختیار کرنے کی توفیق، اختیار اور قدرت ملی ہوئی تھی۔

وحی سے آپؐ کا رشتۂ اتصال وابستہ تھا۔ اس کے باوجود آپؐ ساتھیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ ان سے اپنی راے ظاہر کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔اس پر ان سے بڑے اجر اور ثواب کا وعدہ کرتے تھے۔ آپؐ یہ بھی واضح کرتے تھے کہ: ''لوگ دنیا اور اپنے ذاتی امور کے بارے میں وہ خود زیادہ جاننے والے ہیں''۔

بسا اوقات جب موجودہ صورت حال پر وحی نازل نہ ہوتی تو آپؐ اپنے رفقا کا مشورہ مانتے تھے، جب کہ اگر کسی انسان کے لیے جائز ہوتا کہ وہ شوریٰ سے بے نیاز ہو یا اسے یہ حق ہوتا کہ مشورے کو قبول نہ کرے، اپنی راے سے دست بردار نہ ہو اور شوریٰ کو محض مختلف رایوں سے آگاہی کا درجہ دے، تو یہ اعزاز و اختیار صرف رسولؐ اللہ کے لیے درست ہوتا اور وہی اس کے حق دار بھی تھے، کیونکہ وہ معصوم تھے اور استبداد جیسی غلطی سے منزہ اور پاک تھے۔

معرکۂ احد کے لیے مدینہ سے نکلنے کے مسئلے میں شورائی فیصلے کے منفی نتائج سامنے آئے اور مسلمان دوسرے مرحلے میں گھاٹے میں رہے اور اندیشہ ہوا کہ شورائیت کی رسوائی ہوگی یا اس کی پابندی میں ضعف آجائے گا، تو قرآن مجید نے اس ماحول میں شورائیت کے قطعی حکم کی تاکید کی:

ان سے معاملے میں مشورہ کرو (اور مشورے اور کسی واضح راے تک پہنچنے کے بعد) جب عزم کرلو تو اللہ پر بھروسا کرو۔(اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

جب اللہ کے رسولؐ کو اس کا پابند بنایا گیا تو دوسروں کو پابند بنانا تو بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتا ہے۔ راے کی آزادی اور اس کے اظہار کی آزادی وہ بنیاد ہے، جس پر شورائیت قائم ہوتی ہے، یعنی آزادیِ اظہار کے بغیر شوریٰ کا وجود ممکن نہیں ہے۔

اُمت مسلمہ میں انحراف

اس تاکید کے باوجود اس امت میں سرکشوں کا استبداد جاری رہا۔ ان کی افزایش نسل کثرت سے ہوتی رہی، اور وہ امت میں اس طرح پھیل گئے کہ تاریخ کے بہت سارے مراحل میں اس کے دین و دنیا سبھی کو بگاڑ دیا۔ ان کی مدد علما کے ان گروہوں نے کی، جو ظلم کو خوب صورت لبادے پہنانے میں مگن رہے۔ اس ظلم و زیادتی کا مقصد صرف یہ تھا کہ استبداد اور اہل استبداد کے لیے میدان صاف ہوجائے۔

کسی نے فتویٰ دیا کہ: ''شورائیت ذریعۂ آگاہی ہے، وجہ پابندی نہیں ہے''۔ کسی نے اس پر قیاس کرکے کہ: رسولؐ اللہ نے شیخین ابوبکر وعمر کے ساتھ مشورہ کیا تھا۔فتویٰ دیا کہ: ''شوریٰ کا تقاضا دولوگوں سے مشورہ کرکے بھی پورا ہوجاتا ہے''۔کسی نے کہا کہ: ''تین کے ساتھ مشاورت کافی ہے کیونکہ یہ اقل جمع ہے''۔

بعض حضرات نے جو پچھلی شریعت کے حجت ہونے کے قائل تھے کہا کہ: ''فقط ۱۲/افراد سے مشورہ کافی ہے، جنھیں سلطان یا [اولی الامر] خود متعین کرے گا''۔دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اخذ کی گئی ہے: اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ط (المائدہ ۵:۱۲) ''اور ان میں ۱۲ نقیب''۔ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ: ''بیعت عقبہ اولیٰ میں بیعت کرنے والوں کی تعداد سے شوریٰ کی تعداد نہیں بڑھنا چاہیے''۔غرض وہ بہت سارے اقوال جن کی پشت پر کوئی معتبر دلیل موجود نہیں ہے، انھی کو دلیل بنا کر پیش کیا جانے لگا۔

پھر 'فتنے کے دروازے بند کرنے' اور 'انتشار کے راستے مسدود کرنے' کو بنیاد بنا کر: ''جسے غلبہ حاصل ہوجائے اس کی امامت کو شرعی سند'' سے نواز دیا گیا۔اس طرح ہماری تاریخ کے بہت ابتدائی زمانے سے ظالموں اور جابروں کی حکومت بھی شرعی ہوگئی اور ان کے احکام بھی شرعی طور پر نافذ ہونے لگے۔ یوں اس کے لیے بھی امت تیار ہوچکی تھی کہ فوجی اور عسکری انقلابات کے احکام قبول کرے، یا ان عناصر کے، جو ہر حربے سے انھیں یک رائے کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔

ان احوال کی مخالفت بہت ہی قلیل تعداد میں علماے صالحین نے کی اور بہت دھیمی آواز میں جس پر اکثر وبیش تر کان ہی نہیں دھرا گیا۔

غرض یہ کہ سد ذرائع اور أخذ بالأحوط کی تیغ وتفنگ کے سایے میں مسلم امت نے مستقل مارشل لا اور ایمرجنسی قانون کے سایے میں زندگی گزاری ہے، اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ خلافت راشدہ کے خلاف باغیانہ انقلاب کے بعد سے ہی اس کے سیاسی نظام کی بنیادیں معطل ہوگئیں۔ظلم وجبر اور بزور غلبے پر یقین رکھنے والے خلفا اور سلاطین نے اسلام کا صرف نظام قضا محفوظ چھوڑا، تاکہ بہت سے احوال میں، جب کہ ان کے اقتدار کو کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو، تو اُمت کی بعض ضرورتوں کی حفاظت کے لیے وہ بنیادی ضمانت کا کام دے۔

انحراف کے اسباب

یہ نظام بھی غلط استعمال اور انحراف سے دوچار کردینے کی کوششوں سے محفوظ نہ رہتا، اگر خداترس علما اس کی حفاظت و مدافعت کے لیے بیدار نہ رہتے۔ اس کے باوجود بعض سرکشوں نے جب بھی ان کے لیے ممکن ہوا، اسے مخالفین کی سرکوبی کا ذریعہ بنا ڈالا۔ 'ارتداد' اور 'محاربہ' کے نام پر بعض مخالفین کو قتل کیا گیا تو بہت سارے سیاسی مخالفین پر 'شریعت کی مخالفت' اور 'دین سے بغاوت' کا ٹھپہ لگایا گیا، تاکہ مخالف کو امت کی ہمدردی یا حمایت سے محروم کردینا آسان ہوجائے۔

اگرچہ بعض علما نے ظالم وجابر سلاطین کے سلسلے میں خاموشی کو 'امت کی وحدت کی حفاظت' کی دلیل دے کر جائز بنا دیا، مگر اس استبداد، ظلم اور سرکشی کے بارے میں ایک کلمہ تک زبان سے ادا نہ کیا، جسے ان ڈکٹیٹروں نے قدیم وجدید ہر دور میں اپنایا۔ حالانکہ اس نے بھی تو اُمت میں تفرقہ ڈالا، اس کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور اسے گروہوں میں بانٹ دیا۔ ان آمروں نے انھیں باہم ٹکرانے کے لیے آپس میں تقسیم کردیا۔ اس طرح استبداد اور لوگوں کے غوروفکر اور اظہار کے حق سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کی دیواریں زمین بوس ہوگئیں اور وہ بنیادی ضرورتوں سے محروم کردی گئی۔

ان مسائل کا تیسرا ذمہ دار امت کے افراد کا ان اجتماعی امور سے ناواقف ہونا یا بہت سے لوگوں کا ان سے تجاہل برتنا، لاتعلق رہنا، 'سیاسی کام' سمجھنا، یا قصداً اندھیرے میں رکھے جانے کے استبدادی عمل کو قبول کرلینا ہے تاکہ ان ڈکٹیٹروں اور ان کے حاشیہ بردار اہل علم وقلم کے پیچھے پیچھے چلنے کا عمل آسان ہوجائے۔ یہ جہالت تیسرا بت ہے۔ ان بتوں کی یہ غیر مقدس تکون ہے: ''سرکشوں کا جبر، علما کی بےبسی اور اُمت کے باشندوں کی جہالت''۔

سرکش فرعون نے جب اپنی قوم سے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى [النازعات۷۹:۲۴۔ میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں] کہا تھا، اس وقت اسے عوام کی غفلت، ان کی غیرمشروط اطاعت اور اندھی غلامی سے دھوکا ہوا تھا۔ سرکشوں کو عوامی غفلت واطاعت جیسی کوئی بھی چیز دھوکے میں نہیں رکھتی ہے۔ سرکش حکمران محض ایک فرد ہوتا ہے، جس کے پاس درحقیقت نہ طاقت ہوتی ہے اور نہ اقتدار۔ یہ تو وہ غافل اور پالتو عوام ہیں، جو ظالموں اور غاصبوں کو اپنی پشت اور کندھے پیش کردیتے ہیں تو وہ سوار ہوجاتا ہے۔ یہ اپنی گردن پھیلا دیتے ہیں تو وہ لگام ڈال دیتا ہے۔ یہ سر جھکا دیتے ہیں تو وہ مغرور

ہوجاتا ہے۔ یہ عزت وسربلندی کے اپنے حق سے دست بردار ہوجاتے ہیں تو وہ سرکش ہوجاتا ہے۔

عوام ایسا اس لیے کرتے ہیں کیونکہ انھیں ایک طرف تو دھوکا ہوتا ہے، دوسری طرف خوف۔ یہ خوف بھی محض وہم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سرکش حاکم، ایک فرد کی حیثیت سے لاکھوں اور کروڑوں عوام کے مقابلے میں طاقت ور نہیں ہوسکتا ہے، مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ان عوام کو اپنی انسانیت، عزت وغیرت اور آزادی کا شعور ہوجائے۔ طاقت کے لحاظ سے تو امت کا ہر فرد سرکش حاکم کے برابر ہوتا ہے، مگر یہ سرکش انھیں دھوکا دیتا ہے۔ اور ان کے دل میں وہم ڈال دیتا ہے کہ ''ان کے نفع ونقصان کا اختیار اس کے پاس ہے''۔ ایک فرد یا افراد کا کوئی ٹولہ کسی باعزت باغیرت اور خوددار امت پر زیادتی کرلے، یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد یا ٹولہ ایسی امت پر زیادتی کرے، جو اپنے رب کو پہچانتی ہو اور اس پر ایمان رکھتی ہو اور جو غلامی قبول کرنے سے انکار کردے۔ غلامی، کسی بھی مخلوق اور فرد کی، جو نہ اپنے اور نہ اس کے نفع یا نقصان کا اختیار رکھتا ہے۔

سرکش حاکم اپنی قوم کو لالچ اور دھمکی کے مختلف حربوں سے بے وقوف بناتا ہے۔ وہ اپنی بداعمالیوں اور گمراہی کے باعث اس کی بات مان لیتے ہیں۔ یہ سرکش پہلے تو عوام کو علم کے راستوں سے دُور کردیتے ہیں اور ان سے حقائق کو چھپائے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انھیں بھول جاتے ہیں اور دوبارہ اس کی تلاش بھی نہیں کرتے۔ پھر یہ حاکم ان کے دلوں پر جس طرح کے نقوش چاہتے ہیں، ثبت کردیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے دل ان بناوٹی نقوش سے مانوس ہوجاتے ہیں۔ پھر سرکشوں کے لیے عوام کو بے وقوف بنانا اور ان کی بھیڑ کو اپنے پیچھے لے کر چلنا آسان ہوجاتا ہے۔ عوام کی لگام نرم ہوجاتی ہے اور سرکش حاکم پورے اطمینان کے ساتھ انھیں جس رخ پر چاہتے ہیں ہانکے لیے جاتے ہیں۔

یہ سرکش حکمران اپنے عوام کے ساتھ یہ حرکت اسی وقت کرسکتے ہیں، جب عوام فسق وفجور میں مبتلا ہوں، جادۂ مستقیم سے بھٹک جائیں، اللہ کی رسی کو چھوڑ دیں، ایمان کے پیمانوں کو نظرانداز کردیں اور ان کے لیے فیصلے کا مرجع نہ قرآن ہو، نہ دلیل اور نہ برہان، جب کہ خداترس مومنوں کو دھوکا دینا، انھیں بے وقوف بنانا اور ہوا میں اڑتے ہوئے پر کی طرح ان سے کھلواڑ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہیں سے قرآن مجید نے واضح کیا ہے کہ عوام نے فرعون کی بات مان کیوں لی تھی:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○ (الزخرف ۴۳:۵۴) اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔

ذرا سوچیے، اگر علما و مفکرین، اہلِ قلم اور اربابِ تربیت نے اپنی ذمہ داری ادا کی ہوتی، فسق و فجور کا مقابلہ کیا ہوتا اور تقویٰ کو رواج دیا ہوتا، تو کیا یہ سرکش امت کا استخفاف کر پاتے، اس کی عقل کو کند کر کے اسے تباہی کی طرف گھسیٹ کر لے جانے میں کامیاب ہو سکتے؟ نہیں، ہزار بار نہیں۔

پھر سوچیے، اگر علمائے امت نے (میری مراد صرف فقہا نہیں بلکہ ہر میدان کے ماہرین علوم اور ان میں بھی سرفہرست علمائے دین ہیں) اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا ہوتا۔ فسق و فجور کی ساری شکلوں کا تصور، فکر، اعتقاد، رویہ، معاملات اور عمل کی سطح پر مقابلہ کیا ہوتا تو کیا یہ سب کچھ ہوتا؟ کیا لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہوتے اور کیا یہ سرکش ان کی گردنوں پر سوار ہو پاتے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

کاش، علما نے امت کو سمجھایا ہوتا: ''یہ سرکش حاکم، خدائی کا دعوے دار ہے۔ لوگوں کو اپنے حال اور اپنی حرکتوں کی زبان سے یا انجام کے حوالے سے بلا رہا ہے کہ اسے اللہ کے اختیارات میں شریک تصور کرلیں''۔ اور انھوں نے یہ بتایا ہوتا کہ: ''جابر حاکم کے سلسلے میں خاموشی یا جبر پر رضا مندی یا شوریٰ کو معطل کرنا شرک ہے، جو توحید کے منافی ہے''۔ اور یہ کہ: ''اللہ نہ جابر کی کوئی نیکی قبول کرتا ہے، نہ جبر پر راضی ہونے والے کی، خواہ وہ اسلام کا دعویٰ کرے اور نماز روزہ کا پابند ہو''۔ اگر انھوں نے یہ کیا ہوتا تو کیا اُمت اس مبنی بر جاہلیت استبداد کے سامنے خاموش رہتی اور کیا وہ کسی استبدادی کو اپنا استخفاف کرنے اور اپنے معاملات کا مختارِ کل بننے دیتی؟ نہیں، قطعاً نہیں۔

کاش، امت کے عالموں، مفکروں، مصنفوں، خطیبوں اور داعیوں نے امت کو اس کے حقوق، اس کے واجبات اور اس کے ملّی وجود میں خیر و شر کے دروازوں سے واقفیت کی تعلیم کا اتنا ہی اہتمام کیا ہوتا جتنا اہتمام طہارت کی تفصیلات، نماز کے طریقے، رسولؐ اللہ کو سیدنا سے ملقب کرنے یا ملقب نہ کرنے کی معرکہ آرائی اور آپؐ کے ذکر کے وقت کھڑا ہونے یا کھڑے نہ ہونے کی بحث جتنی تعلیم کا اہتمام ہی کیا ہوتا۔ تب بھی امت کی حالت بدل جاتی اور اس کے شعور کا درجہ بلند ہو جاتا۔

کاش، انھوں نے امت کو سکھایا ہوتا کہ ایسے فرد کی تعظیم و تائید کرنا، اس کے حق میں

نعرے بازی اور ایسے فرد کی خدمت ومعاونت کرنا، جو اللہ کے شعائر کی تعظیم نہ کرے، سراسر ظلم ہے۔ اور یہ ظلم قیامت کے دن کی تاریکی کے مانند ہے۔ یہ تقویٰ سے دُوری ہے، اور جو تقویٰ سے دُور ہوجاتا ہے، وہ فسق میں گر پڑتا ہے، پھر شرک تک جا پہنچتا ہے اور بلاشبہہ شرک بڑا ظلم ہے۔ کاش! انھوں نے سکھایا ہوتا کہ امت کے حکام اور سرکاری عہدے داران دراصل امت کے خادم اور ملازمین ہیں۔ اگر وہ امت کی خدمت میں غلط روش اپناتے ہیں تو امت پر واجب ہے کہ انھیں تبدیل کردے۔

کاش، انھوں نے امت کو یہ سبق بھی پڑھایا ہوتا کہ: ''حکومت اعزاز نہیں، ذمہ داری ہے۔ سیاست امت کے اور پوری امت کے مفادات کی نگہداشت اور ان کی خدمت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شرعی فرائض ہیں، جو ہر فرد پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ اُمت کی ذمہ داری ہے جس سے یا جس کی انجام دہی کے حق سے کوئی دست بردار نہیں ہوسکتا۔ امت کے مادی خزانوں اور افرادی قوت کی دانش بینش کو برباد کرنا جرم ہے۔ امت کے سرمایے میں امت کے دشمنوں کو ترجیح دینا جرم ہے۔ کسی بے گناہ کو نظر بند کرنا جرم ہے۔ کسی انسان کو کسی بھی عوامی مسئلے میں اظہارِ راے سے روکنا جرم ہے۔ اقتدار کے کسی بھی ادارے کا کسی شہری کی آزادی یا عزت پر حملہ کرنا جرم ہے''۔

سوچیے، اگر امت میں ایسے لوگ ہوتے، جو لوگوں کے ان گناہوں اور جرائم کی درجہ بندی کرتے، جو حاکم اور محکوم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ امت کو بتاتے کہ ان میں گناہ کبیرہ کون سے ہیں اور گناہ صغیرہ کون سے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا: حاکم کا استبداد گناہ کبیرہ ہے۔ امت کے ساتھ اس کا مشاورت نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ جو ایسی حالت کو درست قرار دیتا ہو، اس کا عمل بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اس پر خاموشی بھی گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کو اس کی راے کے اظہار سے محروم کردینا گناہ کبیرہ ہے۔

لوگوں کی بے جا نگرانی، ان کی جاسوسی اور ان کی غلطیوں کا ریکارڈ بنانا یہ سب کبائر ہیں۔ اللہ ان پر محاسبہ کرے گا۔ ان کبیرہ گناہوں میں شرکت، ان کی حوصلہ افزائی یا ان پر خاموشی بھی کبائر ہیں۔ امت کی دولت کو تنخواہ اور انعام کے طور پر امت کی جاسوسی کرنے والوں میں بانٹنا مال کا ضیاع، فضول خرچی اور اسراف ہے۔ ظالموں کے معاونین ظلم پر مدد کرنے کے صلے میں جو رقمیں پاتے ہیں، وہ نجس ہیں، حرام ہیں۔ چوری، بغاوت، سود اور زنا کی اجرت سے ان کی حیثیت کسی بھی

طور پر مختلف نہیں ہے۔ اگر یہ ہوجاتا تو سب ظالموں یا کم از کم کچھ ظالموں یا ان کے معاونوں کو ظلم کی چکّی چلانے میں تردد ضرور ہوتا۔ اور بہت سارے لوگوں کو ظالموں کا آلہ کار اور مددگار بننے میں یقیناً تامل ہوتا۔

عالمِ اسلام کی موجودہ کیفیت

عالمِ اسلام کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ آزادیِ رائے کا فقدان اس امت کے بیش تر ملکوں کی پس ماندگی کے بہت سارے اسباب کے پیچھے کارفرما ہے۔ عبدالرحمان کواکبی نے ۱۹۰۱ء میں اپنی کتاب طبائع الاستبداد اور مصارع الاستعباد میں جو لکھا ہے، وہ یہ سمجھنے کے لیے بہت حد تک کافی ہے کہ 'استبداد' سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو کس طرح متاثر کرتا ہے اور کس طرح وہ فعالیت کو ضعف اور طاقت کو بے بسی میں بدل ڈالتا ہے۔

استبداد، تہذیب ساز انسان نہیں بناتا۔ وہ تو بس نرے پُرزے کو ڈھالتا ہے، جو سیاسی نظام کے دائرے میں گھومے اور انسان کے جسمانی (بایولوجیکل) تحفظ کے لیے سب کچھ کرے۔ یہیں سے تہذیب کی از سرِ نو تعمیر کی جدوجہد کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ آغاز میں ہی تہذیبی عمل کے لیے سب سے خطرناک علت یا مہلک تر عامل کو تلاش کرکے درست کیا جائے۔ شاید آزادیِ رائے دوسرے تمام مسائل کے حل کے لیے بھی ایک معروضی اور لازمی شرط قرار پائے۔ کیونکہ کسی چیز کے اندر زندگی اور فعالیت رہ نہیں سکتی ہے، اگر ہر بڑے چھوٹے مسئلے پر غور و فکر، اظہارِ رائے اور تبادلہ خیال کی آزادی نہ ہو۔

یہ اسی وقت ہوگا جب ایک مسلمان کی عقل سے سارے حجابات دُور کردیے جائیں۔ اس کی عقل [intellect] اور دانائی [wisdom] کو سیاسی نظام، جماعت، پارٹی لیڈر، مفتی اور فکری رہنما وغیرہ کی ساری بے جا زنجیروں سے آزاد کردیا جائے۔ اس کے سامنے فکر کے وسیع و عریض بے قید آفاق کھول دیے جائیں۔ عزت و کرامت، آزادی شورائیت اور عدل کے تصورات اس کے دل میں پختہ کردیے جائیں، تاکہ اس کے دل و دماغ میں وہی فکر و خیال جگہ پائیں، جن کے لیے واقعی دلیل موجود ہو اور وہ اس پر مطمئن ہو۔ ایسی صورت میں فرد مجرد کسی نظام یا پارٹی یا مسلک کا بے فہم اور عقل سے عاری پُرزہ نہیں بنے گا، بلکہ وہ صرف حق کا تابع ہوگا اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا مقصد تخلیق بھی یہی ہے۔